Aug
2026

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

اصل معیار

’’میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی، سوال یہ ہے کہ علم کے شوق میں، جستجو کی راہ میں، علم واخلاق کے پھیلانے اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفاکی ودرندگی، دولت وقوت کی پرستش کو روکنے کے لیے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں؟! اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لیے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کرکے اس مقصد کے لیے اپنے کو وقف کرتے ہیں؟!‘‘ (علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں: ۱۲)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

علوم طبیعی و تطبیقی میں مہارت کی ضرورت

مولانا محمد الحسنیؒ

”مغربی نظام تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں ہمارا موقف بالکل واضح، فیصلہ کن اور دوٹوک ہونا چاہیے۔ ہمیں ہر وہ چیز قبول کرنی ہے جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہو، اس لیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس کو ”علم نافع“ سے تعبیر کیا ہے، اس کے علاوہ ہر وہ علم جو انسانیت کے لیے مفید و نافع نہ ہو، اسلام کی نگاہ میں حقیقی علم کہلانے کا مستحق نہیں۔ ایسے بے مقصد علوم میں اپنی عمر عزیز کے قیمتی لمحات ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی اپنے قیمتی اوقات کو دعوت واصلاح اور ارشاد وہدایت کے کاموں میں لگائے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم اپنے تعلیمی مراکز وجامعات کے اندر جدید مغربی فلسفوں اور نظریات کو شامل نصاب کریں جیسے: ڈارون اور فرائیڈ کے افکار، ہیگل اور مارکس کے معاشی وتاریخی نظریات، یا تاریخ کی مادی تعبیر کے مختلف تصورات وغیرہ تو ان افکار ونظریات سے متاثر ہوکر اور ان کو لائق عظمت سمجھ کر شامل نصاب ہرگز نہ کیا جائے بلکہ ان پر ناقدانہ ومحاسبانہ موقف قائم کرنے اور نسل نو کے ذہن ودماغ میں ان کی بے وقعتی پیدا کرنے کے لیے ان کو اپنے نصاب میں جگہ دی جائے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج عالم اسلام کی دانش گاہوں میں اس کے بالکل برعکس صورت حال ہمیں نظر آتی ہے۔

عصر حاضر میں سائنس کی وہ فلسفیانہ بحثیں جن کا تعلق غیب کی باتوں اور غیر محسوسات سے ہے اور انہیں کائنات کے رازہائے سربستہ کو سر کرنے کا دعویٰ ہے، ہمارے نزدیک ایسے بے بنیاد مباحث یونان وروم کے قدیم حکماء کی جاہلانہ قیاس آرائیوں سے کچھ مختلف نہیں، اس لیے کہ ان باتوں کا صحیح علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور ان کا ادراک انسانی عقل وشعور کے بس کی بات نہیں۔ اس سلسلہ میں منصفانہ نظریہ یہ ہے کہ نسل نو کے قیمتی وقت کو ایسی لایعنی اور فضول بحثوں میں الجھنے سے بچایا جائے جن کا زندگی کے عملی میدان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی قوموں کی تعمیر ان سے وابستہ ہے۔

ہماری توجہ کا اصل مرکز وہ علوم طبعیہ (Exact Sciences) ہونے چاہئیں جن کے ذریعہ اسرار کائنات کھلتے ہیں اور خالق حقیقی کی معرفت نصیب ہوتی ہے یعنی علم طبعیات، حیاتیات، فلکیات اور ارضیات وغیرہ۔

اسی کے ساتھ ہمیں تطبیقی علوم (Applied Sciences) میں بھی مہارت پیدا کرنے اور اپنی توانائی خرچ کرنے کی ضرورت ہے یعنی انجینئر نگ، طب، ٹکنالوجی، کمپیوٹر سائنس وغیرہ۔

آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی دانش گاہوں اور جامعات میں ان علوم پر خصوصی توجہ دیں، انہیں اپنی علمی اور صنعتی بیداری کا محور بنائیں اور اپنی نئی تہذیبی ومعاشی تعمیر کی ایک بنیاد قرار دیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان علوم پر پوری طرح قدرت رکھنے کے بعد ہی اقوام عالم کے درمیان عالم اسلام اپنے فرائض منصبی کو بجا طور پر ادا کر سکتا ہے۔“

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۸ — اگست ۲۰۲۶ء - صفر المظفر ۱۴۴۸ھ — شمارہ: ۸

اہل علم کا مقام ومرتبہ

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد مکی حسنی ندوی

محمد امین حسنی ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُونَةٌ، مَلْعُونٌ مَا فِيهَا إِلَّا ذِكْرَ اللَّهِ وَمَا وَالَاهُ، وَعَالِمٌ أَوْ مُتَعَلِّمٌ“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(خبردار! دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی ملعون ہے، سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس چیز کے جو اللہ کے ذکر سے تعلق رکھتی ہو نیز عالم اور علم حاصل کرنے والے کے۔)

(سنن الترمذی: ۲۳۲۲)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: Rs.15/- E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: Rs.150/-

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

علم اور اخلاق (اداریہ)........۳
بلال عبدالحی حسنی ندوی........
تقویٰ کیا ہے؟........۴
بلال عبدالحی حسنی ندوی........
ثبوتِ نسب کے احکام........۶
مفتی راشد حسین ندوی........
دو بنیادی باتیں........۸
مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی........
معاشرہ اور نوجوان........۱۰
مولانا ناصر ندوی پرتاب گڑھی........
جمہوریت–خودکشی کی راہ پر........۱۱
محمد مکی حسنی ندوی........
الحاد کا طوفان، اسباب اور علاج........۱۳
محمد نجم الدین ندوی........
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں........۱۵
محمد امین حسنی ندوی........
پیمانہ محبت........۱۷
محمد مصعب ندوی........
ارتداد کی لہر–اسباب اور علاج........۱۹
محمد ارمغان بدایونی ندوی........

یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ

جناب عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

مجاہدو! اس کو یاد رکھنا، یہ ایک نکتہ ہے عارفانہ
جہادِ حق کارگر نہ ہوگا، اگر نہیں گریۂ شبانہ

ہزار جدت طرازیوں کے لباس بدلا کرے زمانہ
مگر یقیناً رہے گا عامر ـــــ مزاج باطل وہی پرانا

عروج سے بہرہ ور نہ ہوگی کبھی حیاتِ منافقانہ
زباں پہ اسلام کا وظیفہ مگر خیالات کافرانہ

ہماری غفلت کی انتہا کیا' ہماری پستی کا کیا ٹھکانہ
گناہ تو پھر گناہ ٹھہرا عبادتیں بھی ہیں مجرمانہ

نوائے حق کو اگر یہ دنیا قرار دیتی ہے باغیانہ
میں تہمت بزدلی نہ لوں گا مجھے گوارا ہے سر کٹانا

مجھے خبر ہے میں جانتا ہوں یہ دور ہے آگ کا سمندر
مگر غم عشق کا سفینہ اسی کی موجوں پہ ہے چلانا

بلا سے کروٹ نہ لیں اندھیرے بلا سے پروا کرے نہ آندھی
مگر مرا فرض منصبی ہے چراغِ پیہم جلائے جانا

وہ دور نقصان وابتلاء ہو کہ عہد اقبال وکامرانی
وفا کے بندے رضا کے پیکر گزار دیں گے مجاہدانہ

وہ کوئی درگاہ ہو کہ مسجد اگر وہاں از رہِ عبادت
نیاز مندی ہو ما سوا کی تو اس سے بہتر شراب خانہ

قدم قدم پر طرح طرح کی عبادتیں وضع کرنے والو!
بتاؤ کیا تم نے دین حق کو حقیر اور نا تمام جانا

ستیزہ گاہِ عمل سے عامر جو کنج عزلت میں لا بٹھائے
وہ زہد ہے یاس وبزدلی کو جواز دینے کا اک بہانہ

مدیر کے قلم سے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

علم اور اخلاق

تعلیم (Education) ایک ایسا جوہر ہے کہ اگر وہ صحیح خطوط پر دی جائے تو اس کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو بہت کچھ دیا جاسکتا ہے جس کی آج دنیا محتاج ہے لیکن اگر اس کا رخ درست نہ ہو تو پوری انسانیت کو اس کے نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں، اس زمانہ میں سپر پاور طاقتوں کے ذریعہ دنیا میں فساد اور بے چینی کی جو ایک عام فضا نظر آرہی ہے، اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ جب بھی علم اور اخلاق کا توازن بگڑتا ہے تو اس کے نتیجہ میں حالات بگڑتے ہیں اور خودغرضی کا مانسون پوری دنیا پر چھا جاتا ہے۔

تعلیم کا بنیادی مقصد اپنے اخلاق کو سنوارنا اور اپنے اندر انسانیت کا درد پیدا کرنا ہے، اگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد کوئی انسان انسان نہ بنے تو سچی بات یہ ہے کہ اس میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں، افسوس کی بات ہے کہ آج ہماری دانش گاہوں سے ایسے افراد نکل رہے ہیں جن کے سینے میں انسانیت کا درد نہیں، وہ بڑے ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں تو بنتے ہیں لیکن ان کے اندر خودغرضی کی ایک آگ ہے۔

آج دنیا کا حال یہ ہے کہ اس کے پاس ہر طرح کے وسائل موجود ہیں لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کا صحیح استعمال کیا ہے؟ انسائیکلوپیڈیا آف برنائیکا میں ہروشیما اور ناگاساکی پر بم برسانے کا یہ عذر بیان کیا گیا ہے کہ کروڑوں لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے لاکھوں لوگوں کی جانیں لینا ضروری تھا۔ یاد رکھئے! اگر آپ کسی قوم یا کمیونٹی پر ہتھیار اٹھائیں گے تو ان کے اندر بھی انتقام کا ایک جذبہ پیدا ہوگا۔

ایک ترقی یافتہ سماج کے لیے ضروری ہے کہ Cooperation کا مزاج ہو، اس کے بغیر کوئی سماج آگے نہیں بڑھ سکتا، لیکن اس وقت ہمارے ملک میں جس طرح حالات پیدا کیے جارہے ہیں اور تعلیم کو جس طرح Commercialise کیا جارہا ہے، یہ ہم سب کے لیے خطرہ کی چیز ہے، یہ ملک ہمیشہ محبت و پیار اور امن وآشتی کا ملک رہا ہے، افسوس کی بات ہے کہ آج اس ملک کے درختِ اقبال کو گھن لگتا جارہا ہے۔ اس وقت پورے ملک میں خودغرضی کی ایک آگ لگی ہے، خطرہ ہے کہیں اس ملک کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوجائیں، اگر یہاں کے رہنے والوں کو کمزور کیا جاتا رہا تو حقیقت میں اس ملک کی طاقت کمزور ہوگی اور اس ملک کا کوئی خاص وزن باقی نہ رہے گا۔

ان حالات میں اصل ذمہ داری مسلمانوں کی ہے جن کو اللہ نے علم اور اخلاق کا توازن عطا فرمایا ہے، آج سے چودہ سو سال پہلے کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو نظر آئے گا کہ اس وقت پوری دنیا کس طرح خودکشی کے لیے آمادہ تھی اور تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی لیکن ایسے حالات میں فاران کی چوٹیوں سے اسلام کا سورج طلوع ہوا اور اللہ کے نبی ﷺ کی انسانیت نواز تعلیمات اور آپ کی کرم گستری نے پوری دنیا میں انقلاب برپا کردیا ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پودا انہی کی لگائی ہے

آج ہمیں اسی طرز زندگی اور لازوال وسرمدی دولت کو دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرنا ہوگا، صحیح بنیادوں کے ساتھ علم کو فروغ دینا ہوگا اور یہ بتانا ہوگا کہ اس وقت کن اخلاقی قدروں (Moral Vlaues) کی دنیا کو ضرورت ہے۔ ٹکنالوجی کے اس دور میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہم وسائل وآلات کا صحیح استعمال دنیا کو بتائیں اور علم واخلاق کا بہترین امتزاج دنیا کے سامنے پیش کریں۔

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

”حضرت وابصہ بن معبد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے خود یہ بات فرمائی کہ تم نیکی کے بارے میں سوال کرنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے دل سے فتویٰ لو (پوچھو) اس لیے کہ نیکی وہ ہے جس پر نفس اور دل مطمئن ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو من میں کھٹک اور سینے میں خلجان پیدا کرے، اگرچہ فتویٰ دینے والے فتویٰ دے دیں گے۔“ (سنن دارمی: ۲۵۸۸)

اس حدیث میں یقیناً ان لوگوں کا تذکرہ ہے جن کے دلوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی حد تک قلبِ سلیم بنایا ہے اور ان کو اللہ نے کچھ نہ کچھ شریعت کا علم بھی دیا ہے، چاہے وہ پورے عالم نہ سہی لیکن وہ موٹی موٹی باتیں جانتے ہوں پھر ان کے سامنے جب کوئی بات آتی ہے تو اس وقت ان کا دل فیصلہ کرتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ اگر ان کا دل یہ بولتا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے اور ان کو پوری طرح سے اطمینان ہے تو وہ بات صحیح ہے اور اگر ان کو کھٹک ہے لیکن وہ اس لیے پوچھ رہے ہیں تا کہ ان کا کام نکل جائے تو ان کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو جو کھٹک ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ چیز صحیح نہیں ہے بلکہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اسی لیے میں نے بات شروع میں عرض کی کہ اصلاً یہ حدیث ان لوگوں کے لیے جن کو اللہ نے سلامتی قلب سے نوازا ہے۔

اس وقت حالات ایسے ہیں کہ لوگوں کے دل ودماغ میں شیطان نے اس طرح بسیرا کر رکھا ہے کہ دلوں کا فیصلہ غلط ہونے لگا ہے، نفس غلط چیزوں کی طرف جاتا ہے بلکہ آدمی انتہائی نامناسب چیزوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ یہ ایسی صورت حال ہے کہ اس کے نتیجہ میں حالات بگڑتے جارہے ہیں۔

وہ شخص جو شریعت کا علم ہی نہیں رکھتا، جو یہی نہیں جانتا کہ شراب بھی کوئی گناہ کی چیز ہے، یا بہت سی برائیوں کے بارے میں تاویل کرتا ہے جیسے اس زمانہ میں بعض دانشور اور پڑھے لکھے سمجھے جانے والے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی نامناسب تاویلیں کرتے ہیں اور چیزوں کو جائز کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے یہ جوان کی طرف سے فیصلے ہیں ان کا اعتبار نہیں ہے، اعتبار اسی وقت ہوگا جب آدمی کو سلامتی قلب حاصل ہو، پھر وہ دین کا علم بھی رکھتا ہو، اس کے بعد اگر وہ کسی چیز پر مطمئن ہو رہا ہے تو غنیمت ہے ورنہ اسی وقت مطمئن ہوگا جب وہ کسی جاننے والے سے معلوم کرلے گا، تو اس کو پوری طرح سے اطمینان ہو جائے گا لیکن اگر وہ جاننے والوں سے معلوم نہیں کرے گا اور خود بھی نہیں جانتا تو اس کو اطمینان نہیں ہوگا، اگر وہ دین کی اہمیت کو سمجھتا ہے تو پھر صورت حال یہ ہوتی ہے کہ جب تک وہ جاننے والوں سے معلوم نہ کرلے اس وقت تک اس کو پورا اطمینان نہیں ہوتا، جب وہ جاننے والوں سے معلوم کرلے گا تبھی اطمینان ہوگا، خود اس کے دل کو بھی اگر یہ سلامتی حاصل ہے تو وہ فیصلہ کرسکتا ہے، اب لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ دس جگہ پوچھتے ہیں تا کہ ان کے مطلب کا فتویٰ مل جائے، یہ انتہائی نامناسب صورت ہے، وہ اس لیے پوچھتے ہیں تا کہ اپنے مطلب کی چیزیں ان کے لیے جائز قرار دے دی جائیں اور وہ ان پر عمل کرلیں۔

اصل چیز شریعت کا حکم ہے اور ہمیں اسی پر چلنا ہے، جب آدمی کا مزاج اور اس کا دل ودماغ شریعت کے سانچے میں ڈھل جائے اور کسی حد تک نفس بھی کنٹرول میں آجائے تو اس کے بعد دل کا فیصلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، بعض چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو کوئی بھی انسان اچھا نہیں سمجھتا بلکہ بعض مرتبہ جو مسلمان نہیں بھی ہیں لیکن ان کے اندر کچھ انسانیت ہے تو بعض مرتبہ ان کے اندر بھی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ برائی کو برائی سمجھتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ برائی کو اچھا یا اچھائی کو برا کہیں، یہ مزاج اکثر انسانوں میں ہوتا ہے پھر ایمان والوں کا

معاملہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کے اندر یہ صفت اور زیادہ رکھی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ نیکی کے متعلق سب سے پہلے اپنے نفس سے سوال کرو، اس لیے کہ جس پر دل کو اطمینان ہو تو سمجھ لو کہ نیکی ہے اور جو دل یا سینے خلجان پیدا کرے تو یاد رکھو! وہ گناہ ہے چاہے لوگ فتویٰ دے دیں۔

آج کے دور میں فتویٰ دینے والے بھی ہر طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہوتے ہیں جو اس کے اہل ہوتے ہیں اور ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ فہم وبصیرت دی ہوتی ہے، وہ لوگ جو فتویٰ دیتے ہیں تو ان کا اعتبار ہوتا ہے لیکن اس دور میں یہ ایک عجیب بات ہے اور لوگوں کا ایک عام مزاج بنتا چلا جا رہا ہے کہ ہر آدمی مفتی بن جاتا ہے، جو دین وشریعت سے واقف نہیں، بعض مرتبہ وہ لوگ جنھوں نے دین کی تعلیم بھی حاصل نہیں کی لیکن وہ مسائل بتانے کے لیے تیار ہیں، دین کے بارے میں رائے زنی کر رہے ہیں، یہ جو ایک عام رواج ہو گیا ہے اس چیز نے پوری امت کو مصیبت میں ڈال دیا ہے، یہ اس وقت کا ایک بڑا فتنہ بن چکا ہے۔ دعوت وفکر اور دین کے نام پر وہ لوگ جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں' رائے زنی کرتے ہیں، نہ وہ دین سے واقف ہیں، نہ شریعت سے، نہ سنت سے واقف ہیں اور نہ سیرت سے لیکن وہ دین کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔

اکثر یہ دیکھا گیا کہ اس وقت جو ایک بڑا فتنہ پیدا ہو گیا ہے عام لوگوں میں اور خاص طور سے وہ دانشور طبقہ جس کا اہل دین سے تعلق نہیں، مشائخ سے تعلق نہیں، ان کے دماغ میں یہ آجاتا ہے کہ ہم اصحابِ علم یعنی پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ہمیں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، ہم خود مطالعہ کر سکتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ براہ راست قرآن مجید کا صرف ترجمہ پڑھتے ہیں اور کچھ حدیثیں پڑھ لیتے ہیں اور پھر رائے زنی شروع کر دیتے ہیں۔

عجیب وغریب بات ہے، کوئی انجینئر ہو اور بولے کہ میں پڑھا لکھا ہوں اس لیے مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں، میں خود اپنا علاج کر سکتا ہوں، کوئی نقشہ نویس ہو اور وہ سوچے کہ جب میں نقشہ بنا لیتا ہوں تو سب کچھ کر لوں گا، مجھے کسی اور کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر ایک کو الگ الگ فہم عطا فرمایا ہے، ہر آدمی اپنے ذوق سے علم کے کسی شعبہ میں اختصاص کرتا ہے اور مہارت پیدا کرتا ہے، میڈیکل لائن میں تو یہ حال ہے کہ ایک آنکھ کا ڈاکٹر ہے، ایک کان کا، ایک پیٹ کا، پیٹ میں بھی الگ الگ ہیں، آنکھ کا ڈاکٹر ہاتھ کی بیماری نہیں دیکھ سکتا، دانت کا ڈاکٹر ہے تو وہ آنکھ کی بیماری نہیں دیکھ سکتا اور یہ بات پوری دنیا میں تسلیم شدہ ہے، مگر عجیب حال ہے کہ دین کے مسئلہ کو لوگوں نے بالکل ہلکا سمجھ لیا ہے، جب کہ جس طرح میڈیکل لائن میں ایک ایک جزئیہ ہوتا ہے اور اس کے ماہرین ہوتے ہیں، آج کے دور میں اسی لیے ایم ڈی کرایا جاتا ہے اور جو لوگ نہیں کرتے تو ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔

علم دین کی لائن میں بھی غیر معمولی تفصیلات، باریکیاں اور جزئیات ہیں، آپ اگر صرف فن حدیث کو لے لیجیے تو اس کی بھی کئی شاخیں ہیں، رجال کا فن الگ ہے، مصطلحات کا فن الگ ہے پھر متون اور شروحات کی الگ تفصیلات ہیں، اسی لیے فن حدیث میں بھی الگ الگ اختصاص ہوتا ہے، بعض لوگ رجال کے ماہر ہوتے ہیں، بعض لوگ مصطلحات کے ماہر ہوتے ہیں اور بعض لوگ متون وغیرہ کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تفسیر وفقہ کے علوم ہیں، اسی طرح صرف ونحو کا علم ہے جس کا شمار مبادیات میں ہوتا ہے، اسی طرح فن بلاغت ہے جس کے بغیر قرآن مجید کے بہت سے حقائق کو سمجھنا آسان نہیں۔ یہ سارے فنون اپنی جگہ پر مسلم ہیں، اگر کوئی شخص اپنے فن کے علاوہ میں رائے زنی کرے تو وہ نہیں کر سکتا، اگر کوئی محدث فتویٰ بتائے تو اس کے اندر فتویٰ بتانے کی وہ اہلیت نہیں ہوگی، وہ محتاط رہے گا، ایک بڑا مفسر بھی محتاط رہے گا، اسی طرح ایک بڑا مفتی حدیث کی تحقیق نہیں کرے گا بلکہ بتائے گا کہ یہ میرا اصل موضوع نہیں ہے، آپ کسی ماہر فن سے رجوع کر لیجیے، جب کہ مفتی دوسرے علوم میں بہت کچھ مہارت رکھتا ہے۔

ثبوت نسب کے احکام

مفتی راشد حسین ندوی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں نسب کا ذکر بندوں کے اوپر اپنی ایک نعمت کے طور پر کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَصِهْراً﴾(الفرقان: ٥٤) (اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا تو اس کو نسبی اور سسرالی رشتہ والا بنایا۔)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی صاف صاف بیان کر دیا کہ اس نے جو مختلف خاندان اور قبائل میں انسان کو تقسیم کر رکھا ہے، وہ صرف ایک دوسرے کو پہچاننے کے لیے ہے، ورنہ کسی خاص خاندان کا فرد ہونے میں فی نفسہ نہ تو کوئی عزت وشرف کی بات ہے، نہ ذلت وتحقیر کی بات، اللہ کے نزدیک معزز تو وہی ہے جو تقویٰ اور ذاتی کمال میں بڑھا ہوا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَى......الآية﴾(الحجرات: ١٣) (اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور برادریاں بنا دیں تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بلاشبہ اللہ کے یہاں تم میں سے بڑا عزت دار وہ ہے جو تم میں سے برا پرہیزگار ہو۔)

اور چونکہ سب خاندان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں لہٰذا اس اعتبار سے کسی کو کسی پر فضیلت اور برتری حاصل نہیں ہے، ہر ایک جس خاندان کا ہے اسی کو اللہ کی نعمت سمجھنا چاہیے، اپنے خاندان کو چھوڑ کر اپنی نسبت کسی اور خاندان کی طرف کرنا صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان احساس کمتری کا شکار ہو اور اپنے خاندان کو حقیر سمجھتا ہو، اسی لیے اس سے سختی سے روکا گیا اور اس پر شدید نکیر کی گئی، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من ادعىٰ إلىٰ غير أبيه...الحديث" (البخاري: ٦٧٦٦، مسلم: ٦٣، عن سعد بن أبي وقاصؓ) (جو شخص حقیقی باپ کے علاوہ اپنے کو دوسرے باپ کی طرف منسوب کرے بحالے کہ وہ جانتا ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔)

اسی طرح حضرت علیؓ کے واسطہ سے ایک طویل حدیث میں ہے:

"ومن ادعىٰ إلىٰ غير أبيه أو انتمىٰ إلىٰ غير مواليه..الحديث"(مسلم: ١٣٧٠، وفي البخاري معناه)

(جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے فرض کو قبول کریں گے نہ نفل کو۔)

اسی طرح ان والدین پر بھی سخت نکیر کی گئی جو جان بوجھ کر اپنے بچوں کے نسب کا انکار کریں، یا باپ کے علاوہ کی طرف نسبت کریں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جب آیت ملاعنہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"أيما امرأة أدخلت علىٰ قوم من ليس منهم..الحديث"(أبو داؤد: ٢٢٦٣، نسائي: ٣٤٨١)

(جو عورت کسی قوم پر ایسے شخص کو داخل کر دے جو ان میں سے نہ ہو تو اس عورت کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اس عورت کو اپنی جنت میں داخل نہیں فرمائے گا اور جو مرد اپنے بیٹے (کے نسب) کا انکار کر دے جو کہ وہ بیٹا اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے پردہ کر لے گا اور تمام مخلوقات کی موجودگی میں اولین اور آخرین کے درمیان اس کو رسوا کر دے گا۔)

پھر شریعت نے شکوک وشبہات کی بیخ کنی کرتے ہوئے فراش کو بڑی اہمیت دی تا کہ بلا وجہ کوئی بچہ کا انکار کر کے اس کی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرنے کی کوشش نہ کرے اور بچہ زندگی بھر کے لیے لوگوں کے طعنوں سے محفوظ رہے، چنانچہ عام اصول بنا دیا گیا کہ اگر مرد وعورت

شادی شدہ ہوں اور کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ شوہر ہی کا بچہ سمجھا جائے گا، صرف زبانی انکار سے وہ ذمہ داریوں سے بھاگ نہیں سکتا، ہاں! اگر اس کو پکا یقین ہو کہ بچہ اس کا نہیں ہے تو اسے لعان کرنا ہوگا (جس کے لیے دار الاسلام اور قاضی کی موجودگی ضروری ہوگی) اور لعان کی مکمل کاروائی کے بعد ہی وہ بچہ کے نسب کا انکار کر سکے گا اور یہ اصول بھی بنا دیا گیا کہ بدکاری سے نسب ثابت نہیں ہوگا، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آنحضور ﷺ سے نقل کرتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "الولد للفراش وللعاهر الحجر" (بخاری: ۲۰۵۳، مسلم: ۱۴۵۷) (بچہ فراش کا یعنی اس شخص کا ہوگا، عورت جس کے نکاح میں ہے اور زانی کو سنگ سار کیا جائے گا/ یا زانی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔)

مندرجہ بالا احادیث اور نصوص نیز دوسرے دلائل کے پیش نظر نسب کے متعلق فقہاء نے بہت سی جزئیات تحریر فرمائی ہیں، ان میں سے چند ضروری احکام مندرجہ ذیل ہیں:

۱-ثبوت نسب کے مراتب:

پہلا مرتبہ یہ ہے کہ مرد و عورت کا نکاح ہوا ہو تو اگر عورت کے بچہ پیدا ہو تو وہ اس کے شوہر ہی کا سمجھا جائے گا، خواہ وہ دعویٰ کرے یا نہ کرے اور اگر وہ کہے کہ بچہ میرا نہیں ہے تو محض انکار سے نسب کی نفی نہیں ہوگی، اس کے لیے لعان کی ضرورت ہوگی۔ (ہندیہ: ۱/ ۵۳۶)

۲- دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ام الولد (وہ باندی جس سے ایک بچہ پہلے پیدا ہو چکا ہو) کے بچہ پیدا ہو تو آقا خواہ دعویٰ کرے کہ میرا بچہ ہے یا نہ کرے، بچہ اسی کا مانا جائے گا، البتہ انکار کر دے کہ بچہ میرا نہیں ہے تو لعان کے بغیر بچہ کے نسب کی نفی ہو جائے گی۔ (أیضاً)

۳- تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ عام باندی سے بچہ پیدا ہو تو اس بچہ کا نسب آقا سے اسی وقت ثابت ہوگا جب آقا دعویٰ کرے کہ یہ میرا بچہ ہے۔ (أیضاً)

اب غلام باندی کا دور ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اخیر کی دو شکلیں نہیں مانی جاسکتیں، ان کو یہاں صرف جانکاری کے لیے بیان کر دیا گیا ہے۔

نکاح کے بعد ثبوتِ نسب کی مدت:

کوئی شخص اگر کسی عورت سے نکاح کرے اور اس عورت سے نکاح کے دن سے چھ مہینے یا اس کے بعد بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ شوہر ہی کا مانا جائے گا، شوہر اقرار کرے یا نہ کرے اور اگر شوہر یہ کہے کہ بچہ اس عورت سے پیدا نہیں ہوا ہے تو اگر دایہ یا زچگی کے امور کو انجام دینے والی ڈاکٹر اس کی گواہی دے دے تو اس ایک عورت کی گواہی ثبوت نسب کے لیے کافی ہوگی، شوہر کو اگر بچہ کا انکار کرنا ہے تو اس کو لعان کرنا پڑے گا اور اگر بچہ کی ولادت نکاح کے دن سے چھ مہینے سے کم میں ہو تو اس بچہ کا نسب شوہر سے نہیں سمجھا جائے گا، اس لیے کہ حمل کی کم سے کم مدت شرعاً چھ ماہ ہے، تو بچہ اگر اس سے پہلے پیدا ہوا تو ظاہر ہے کہ وہ نکاح سے پہلے کا ہے، لہٰذا اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

(ہدایہ مع فتح القدیر: ۴/ ۱۷۸، باب ثبوت النسب، ہندیہ: ۱/ ۵۳۶)

مندرجہ بالا احکام ہی کی بنیاد پر فقہاء احناف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر ظاہری طور پر میاں بیوی کی ملاقات سالوں سے نہ ہوئی ہو تو بھی اگر عورت کے شادی کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو شرعاً وہ ثابت النسب ہوگا، اس لیے کہ حدیث میں "الولد للفراش" (بچہ فراش (یعنی شوہر) کا ہے) فرمایا گیا، لہٰذا اس بچہ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کرنا جائز نہ ہوگا، اس لیے کہ اگرچہ ظاہری طور پر دونوں نہ ملے ہوں لیکن ہوسکتا ہے کسی طریقہ سے خفیہ طور پر ان کی ملاقات ہوئی ہو جس کا علم لوگوں کو نہ ہوا ہو، اگر بچہ واقعی شوہر کا نہ ہوگا تو وہ خود ہی لعان کے ذریعہ اس کی نفی کر دے گا۔ (شامی: ۳/ ۵۰۰)

اسی طرح اگر کسی نے عورت سے شادی کی، پھر رخصتی ہونے سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی تو اگر طلاق سے چھ مہینے کے اندر اندر عورت کے کوئی بچہ پیدا ہو تو شرعاً وہ ثابت النسب ہوگا، بشرطیکہ نکاح کو چھ مہینے یا اس سے زیادہ گزر چکے ہیں، اگر شوہر کو بچہ کی نفی کرنا ہو تو اسے لعان کرنا ہوگا اور اگر طلاق کے چھ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب اس سابقہ شوہر سے ثابت نہیں ہوگا۔

(رد المحتار شامی: ۳/ ۵۴۲)

دو بنیادی باتیں

مولانا عبدالسبحان ناخدا مدنی ندوی

اللہ رب العزت نے سورۂ اعراف میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ بیان کرنے کے بعد بنی آدم کو کچھ اہم ہدایات دی ہیں، ان میں ایک ہدایت ''پاکیزگی'' کی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ أَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِيْ سَوْءَاتِكُمْ وَرِيْشاً وَلِبَاسُ التَّقْوَىَ ذَلِكَ خَيْرٌ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْن ﴾(الأعراف: ٢٦) (اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور تمہارے لیے باعث زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس سب سے بہترین لباس ہے اور یہ اللہ کی نشانیاں ہیں شاید کہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔)

اسی کے ضمن میں اللہ رب العزت نے حیا کے پیغام کو اتارا۔ حقیقت میں توحید کے بعد جو تعلیمات حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے چلی آئی ہیں، ان میں سب سے بنیادی تعلیم ''حیا'' کی تعلیم ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا بَنِيْ آدَمَ لاَ يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْءَاتِهِمَا إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لاَ تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِيْنَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْن ﴾(الأعراف: ٢٧) (اے بنی آدم! ہرگز شیطان تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کرے، جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا تھا، ان کے لباس کو اتارتے ہوئے تاکہ ایک دوسرے کو ان کی شرم گاہیں دکھائے اور شیطان اور اس کا پورا ٹولہ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم اسے نہیں دیکھتے ہو اور ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنایا ہے جن میں ایمان نہیں ہے۔)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے نام یہ پیغام دیا کہ ﴿يَا بَنِيْ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ﴾ (اے بنی آدم! جب کبھی تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول آئیں گے تو وہ تمہارے سامنے میری آیات کو بیان کریں گے۔)

اس آیت میں گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشین گوئی کی گئی بلکہ اللہ کی طرف سے صراحۃً اعلان کیا گیا کہ میں رسولوں کا سلسلہ جاری کروں گا اور میرے پیغمبر آکر میری آیات تلاوت کرتے رہیں گے، گویا اللہ کی طرف سے یہ اعلان بھی ہوا کہ ان رسولوں پر اللہ کی طرف سے ہدایات ربانی اتاری جائیں گی۔

اس کے بعد اسی آیت میں تمام انسانوں کی ذمہ داریوں کو دو بنیادی باتوں میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا، ارشاد ہوا:

﴿فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اصلاح کر لی تو ایسوں پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ ہی وہ غم گین ہوں گے۔)

اللہ کا ڈر اور دل میں اس کا خوف جسے ہم تقویٰ اور خشیت کہتے ہیں' اسلام میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ جس طرح ایمان کی بنیاد پر اعمال قدر و قیمت پاتے ہیں اور اگر ایمان نہ ہو تو بڑے سے بڑا عمل قابل قبول نہیں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿أُوْلَئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ﴾

(الأحزاب: ١٩)

(یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے بس اللہ نے ان کے سب کام اکارت کر دیئے۔)

ٹھیک اسی طرح ایمان کے بعد تقویٰ کی بنیاد پر بھی اعمال قبول کیے جاتے ہیں، ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾(المائدة: ۲۷)

(بلاشبہ اللہ تو پرہیزگاروں ہی سے قبول فرماتے ہیں۔)

جس دن ہمارے اندر خوف الٰہی یا تقویٰ کی یہ صفت حقیقی معنی میں پیدا ہو جائے گی تو ہم دنیا کے ہر کونے کو اپنے لیے مبارک بنا سکتے ہیں، ہم مکہ مدینہ میں ہوں، یا لندن و پیرس میں، اگر ہمارے دل کے اندر اللہ کا خوف ہے، ہمارے سامنے حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان ہے:

"إِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ مَا كُنْتَ"

(تم جہاں کہیں بھی رہو، خدا کا خوف اختیار کرو۔)

اگر ہمارے اندر یہ جذبہ ہے تو ہم اپنے ہر لمحہ کو قیمتی بنا سکتے ہیں، اگر ہم اچھے مقامات پر ہوں گے تو ہماری زندگی اور بہتر بنا دی جائے گی اور اگر ہم غلط مقامات پر بھی رہیں گے تو خدا کے دین اور تقویٰ کے چراغ کو روشن کرتے ہوئے ہم اچھی زندگی بسر کرنے والے بنیں گے۔

خوف خدا کا یہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرنے کے ساتھ پوری اس کو انسانیت کے لیے عام کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، اسی کو اوپر آیت میں ''اصلاح'' کے عمل سے تعبیر کیا گیا ہے، آدمی جہاں کہیں بھی رہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اصلاح کا کام کرے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کے اندر جو صلاحیت ہو، اس کے ذریعہ اصلاح کا کام کرنے کی کوشش کرے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے صاف اعلان ہے کہ اس کے لیے ہر طرح کا خوف اڑا دیا جائے گا، اس کے لیے ہر طرح کے ٹینشن کو ختم کر دیا جائے گا، فرمایا:

﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

(ایسوں پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔)

آخرت کے لحاظ سے خوف و غم کا تو کوئی نام و نشان ہی نہیں ہوگا، تاہم اگر کوئی دنیا میں بھی اس طرح کی زندگی بسر کرے گا تو اس کو خوفِ خدا کے علاوہ کسی کا خوف باقی نہیں رہے گا، اس میں شبہ نہیں کہ ان پر بھی غم آتے ہیں اور غم آئیں گے لیکن وہ ہر غم کو تقرب الیٰ اللہ کا ذریعہ بنائیں گے اور جو چیز تقرب الیٰ اللہ کا ذریعہ بنتی ہے وہ غم نہیں رہتی بلکہ وہ تو ایک قسم کی خوش خبری ہے۔

ہم میں سے ہر فرد سب سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اس سلسلہ میں کبھی غفلت کا شکار نہ ہو، ہر انسان دنیا بھر کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے لیکن خود کو دھوکہ کبھی نہیں دے سکتا، اگر آدمی کا دل زندہ ہے اور وہ مسلسل اپنا جائزہ لیتا رہے تو اس کے اندر اصلاح کا جذبہ ہمیشہ باقی رہے گا، اگر آپ پر لوگ تنقید کریں تو اس کو بھی اپنی اصلاح کا ذریعہ بنائیے، یاد رکھیں! جس دن آپ نے یہ سمجھ لیا کہ ہم درجہ کمال کو پہنچ گئے تو اسی دن سے آپ کا زوال شروع ہو جائے گا، ہر انسان اپنی اصلاح کا محتاج ہے، اس کے ساتھ جو اس سے متعلق لوگ ہیں ان کی اصلاح بھی اس کی ذمہ داری ہے، یہ ایسا مبارک عمل ہے جو تسلسل چاہتا ہے اور اگر یہ کام پائیداری سے ہوتا رہے تو پھر اللہ کا عذاب کبھی نہیں آتا، خدا کا کلام اس کی گواہی دیتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ﴾ (اور آپ کا رب ایسا ہے ہی نہیں کہ زبردستی کسی بستی کو تباہ کر دے جب تک کہ وہاں کے لوگ اصلاح کا عمل کرتے رہیں گے۔)

اصلاح کا یہ عمل ہمیں اس وقت تک کرنا ہے جب تک ہماری آخری سانس نہ آ جائے اور ہم اللہ کے دربار میں حاضر نہ ہو جائیں:

﴿إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾(هود: ۸۸)

(میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جتنا بھی میں کر سکوں اور مجھے توفیق اللہ ہی کی طرف سے ملتی ہے اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔)

ہم مسلمانوں اور خاص طور پر طبقہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی انسانیت نواز تعلیمات کو لیں اور بندگان خدا تک پہنچائیں، ہم یہ سمجھیں کہ اس وقت دنیا کی تمام قومیں ہمارے سامنے کاسہ گدائی لیے ہوئے کھڑی ہیں، ہمارا فریضہ ہے کہ اس کٹورے کو محسن انسانیت ﷺ کے فیض سے بھر دیں اور ہم دنیا کے فقر کو دور کریں۔

اگر ہم نے ایسا کر لیا تو اللہ کی طرف سے رحمتیں نازل ہوں گی اور ہم اس کی طرف سے کرمِ مسلسل کا مشاہدہ کرتے رہیں گے۔

معاشرہ اور نوجوان

مولانا ناصر الدین ندوی پرتاب گڑھی

ہر قوم کی زندگی میں نوجوان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔قوموں کی عزت وعظمت،ترقی و بلندی اور قیادت وسیادت کا انحصار اسی طبقے پر ہوتا ہے،نوجوانوں کا جوش و ولولہ،قربانی و ایثار، جدوجہد اور خلوص ہی دراصل قوم کی روح ہوتا ہے،اگر نوجوان بیدار وباخبر ہوں،بااخلاق وباکردار ہوں اور مقصدزندگی سے آگاہ ہوں تو معاشرہ خوش حال، صالح اور ترقی یافتہ ہو جاتا ہے لیکن اگر یہی نوجوان بے راہ رو، غافل ولا ابالی، ناسمجھ اور خودغرض ہوں تو پورا معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔

ہم جس معاشرہ میں جی رہے ہیں،وہ بہت سے داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار ہے،اخلاقی انحطاط،دینی کمزوری،معاشی مسائل، تعلیمی پس ماندگی اور تہذیبی شکستگی کا گہرا اثر آج کے نوجوانوں پر پڑ رہا ہے۔ہمارے نوجوانوں کی بڑی تعداد بے مقصد، وقت گزاری، منشیات،فحش مواد،فلم بینی،گانوں اور سوشل میڈیا کے فتنوں میں غرق ہو چکی ہے۔تعلیم اور محنت سے گریز،دین سے دوری،بڑوں کی نافرمانی اور دینی اقدار سے بےزاری عام ہوتی جارہی ہے،ایسے ماحول میں اگر نوجوان خودکو نہ سنبھالیں تو نہ صرف وہ اپنی زندگی برباد کربیٹھیں گے بلکہ پورا معاشرہ گمراہی اور تنزلی کی مہیب کھائی میں گر جائے گا۔

ابھی وقت ہے کہ نوجوان خودکو پہچانیں،اپنی اہمیت اور ٹیلنٹ کو سمجھیں،خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کا درست استعمال کریں،نوجوانوں کو یہ جاننا ہوگا کہ وہ کسی معمولی مخلوق کا نام نہیں بلکہ وہ اسلام کے علم بردار،ملت کے معمار اور قوم کے نگہبان ہیں۔ان کے اندر وہ قوت ہے جو معاشرہ کو بدل سکتی ہے،امت کو جگا سکتی ہے،دین کی سربلندی اور انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے،مگر یہ سب کچھ تبھی ممکن ہے جب وہ علم حاصل کریں،عمل سے جڑیں،اخلاق کو اپنائیں،کردار کو پاکیزہ رکھیں،دین سے محبت کریں اور اپنے وقت کو قیمتی بنائیں۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ اپنے وقت کا درست استعمال سیکھیں، کتابوں سے رشتہ جوڑیں، علمائے دین سے رہنمائی لیں، رفاہی خدمات، اصلاحی تنظیموں،تعلیمی اور فکری سرگرمیوں میں حصہ لیں، اپنے اندر قیادت و اخلاص،تحمل وقربانی اور صبر جیسے اوصاف پیدا کریں،اصحابِ کہف کی طرح باطل کے خلاف ڈٹنے والے ہوں، حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ کی طرح بہادر بنیں،اپنی ذمہ داری کے تئیں مخلص ہوں،حضرت مصعب بن عمیرؓ کی طرح دعوت کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے والے ہوں۔

آج کا نوجوان اگر چاہے تو فتنۂ باطل کے اس طوفان کا رخ موڑ سکتا ہے،اگر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے وقت نکالے،اپنی توانائی کو حق وصداقت کے لیے کھپائے تو وہ معاشرہ میں روشنی کا چراغ بن سکتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی ایسی ہی تربیت کی،ان کے دلوں میں اللہ کا خوف،آخرت کا یقین،انسانوں کی خدمت کا جذبہ اور دنیا کی بے ثباتی کا شعور پیدا کیا،یہی وہ فکر ہے جو آج کے نوجوانوں کو درکار ہے۔

معاشرہ کے ہر فرد پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں،نوجوانوں کی صحیح تربیت کرے، انہیں علم وحکمت، کردار و اخلاق،دینی شعور اور قومی غیرت سے آراستہ کرے،تعلیمی ادارے ہوں یا دینی مراکز، اسکول وکالج ہوں یا یونیورسٹی، والدین وسرپرست ہوں یا علماء ودانشور،ہر کسی کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا، نوجوانوں کو صرف نصیحت سے نہیں بلکہ محبت،عملی رہنمائی اور مثالی کردار سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔

جمہوریت خودکشی کی راہ پر

سید محمد مکی حسنی ندوی

ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد 26 جنوری 1950ء کو نافذ ہونے والے آئین نے اس ملک کو ایک ایسی جمہوری ریاست کی حیثیت عطا کی جس کی بنیاد عوام کی حاکمیت، قانون کی بالادستی، بنیادی حقوق، آزاد عدلیہ، وفاقی نظام، آزاد انتخابات اور مذہبی آزادی جیسے اصولوں پر رکھی گئی۔ طویل عرصہ تک ہندوستان کی جمہوریت کو ترقی پذیر ممالک کے لیے ایک کامیاب نمونہ قرار دیا جاتا رہا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اقتدار کی پرامن منتقلی، مضبوط انتخابی نظام اور آئینی اداروں کی فعالیت کو اس کامیابی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

اکیسویں صدی خصوصاً گزشتہ ایک دہائی میں ہندوستانی جمہوریت کی نئی شکل نے جنم لیا ہے، موجودہ سیاسی جماعت کے اقدامات جمہوریت کے اصولوں کو کمزور کرتے جا رہے ہیں، جبکہ یہی لوگ ان اقدامات کو قومی سلامتی، بہتر حکمرانی، ترقی اور بدعنوانی کے خاتمہ کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان کے آئین سازوں نے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہوں، حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہو، عدلیہ آزاد ہو اور پارلیمنٹ عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔ آزادی کے بعد کئی دہائیوں تک مختلف جماعتیں اقتدار میں آتی اور جاتی رہیں جس سے یہ تصور مضبوط ہو کہ ہندوستانی جمہوریت مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔

جمہوریت صرف انتخابات کا نام نہیں بلکہ اختلافِ رائے کا احترام، اداروں کی خودمختاری، آزاد میڈیا، شفاف احتساب اور آئین کی بالادستی بھی اس کے لازمی عناصر ہیں۔ جب ان اصولوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے تو جمہوریت کا ڈھانچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔

ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ میں 25 جون 1975ء کا دن ایک اہم موڑ سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ بنیادی حقوق معطل کر دیے گئے، ہزاروں سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا، اخبارات پر سنسر شپ نافذ ہوئی اور حکومت پر تنقید تقریباً ناممکن ہو گئی۔

ایمرجنسی صرف اکیس ماہ جاری رہی لیکن اس نے یہ ثابت کر دیا کہ جمہوری ادارے بھی غیر معمولی سیاسی طاقت کے سامنے کمزور پڑ سکتے ہیں۔ بعد ازاں انتخابات ہوئے اور حکومت تبدیل ہوئی جسے جمہوریت کی بحالی قرار دیا گیا۔

2014ء کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ مضبوط اکثریتی حکومت نے متعدد اہم فیصلے کیے۔ حکومت کا موقف تھا کہ مضبوط مینڈیٹ (پارلیمانی اکثریت) سے تیز رفتار اصلاحات ممکن ہو سکتی ہیں، جبکہ اقتدار کا غیر معمولی ارتکاز پارلیمانی مباحثے اور وفاقی توازن کو کمزور کر رہے ہیں۔ پارلیمنٹ میں کئی اہم قوانین محدود بحث کے ساتھ منظور کیے گئے۔ اپوزیشن کا کہنا تھا کہ پارلیمانی کمیٹیاں حکومت کے میلان کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔

8 نومبر 2016ء کو حکومت نے اچانک بڑے کرنسی نوٹ منسوخ کرنے کا اعلان کیا۔ حکومت کے مطابق اس اقدام کا مقصد کالے دھن، جعلی کرنسی اور دہشت گردی کی مالی معاونت پر قابو پانا تھا لیکن اس فیصلہ سے لاکھوں مزدور چھوٹے تاجر اور دیہی معیشت شدید متاثر ہوئی۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ جب حکومت کو مکمل بالادستی مل جاتی ہے تو پھر وہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنا فیصلہ تھوپ دیتی ہے۔

5 اگست 2019ء کو حکومت نے جموں و کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت ختم کر دی۔ حکومت نے اسے قومی اتحاد، ترقی اور مکمل انضمام کی جانب تاریخی قدم قرار دیا اور یہ فیصلہ حکومت نے ریاستی اسمبلی کی عدم موجودگی، مقامی قیادت کی گرفتاری، مواصلاتی پابندیوں اور طویل انٹرنیٹ بندش کے ساتھ لیا تاکہ کوئی اس کے اس فیصلہ کے خلاف اپنی بات نہ رکھ سکے، یہ جمہوریت کو قتل کرنے کی طرف اقدامات ہیں۔

2019ء میں منظور ہونے والا شہریت ترمیمی قانون ملک بھر میں شدید سیاسی مزاحمت کا سبب بنا، حکومت کے مطابق اس قانون کا

مقصد پڑوسی ممالک میں مذہبی ظلم کا شکار بعض اقلیتوں کو شہریت دینا تھا۔

سچائی یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر شہریت قانون آئین کے اصول کی خلاف ورزی ہے، اس کے خلاف ملک کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانہ پر احتجاج ہوئے جن میں طلبہ، خواتین اور سماجی کارکنوں نے حصہ لیا، حکومت نے واضح کیا کہ یہ قانون کسی ہندوستانی شہری کی شہریت چھیننے کے لیے نہیں لیکن یہ حکومت کی ریشہ دوانیاں ہیں۔

2020ء میں تین زرعی قوانین منظور کیے گئے۔ حکومت نے انہیں زرعی اصلاحات قرار دیا لیکن لاکھوں کسانوں نے ان قوانین کے خلاف تاریخی احتجاج کیا، دہلی کی سرحدوں پر کئی ماہ تک جاری رہنے والے مظاہروں کے بعد حکومت نے 2021ء میں یہ قوانین واپس لے لیے۔

یہ واقعہ اس بات کی علامت بنا کہ جمہوریت میں عوامی احتجاج پالیسی سازی پر اثر انداز ہوسکتا ہے لیکن اس دوران احتجاج، مذاکرات اور حکومتی رویے پر شدید تنقید ہوئی۔

انفورس منٹ ڈائریکٹوریٹ (ED)، سی بی آئی (CBI) اور انکم ٹیکس محکمے اس حکومت کے لیے ایسے ہیں جیسے ماضی میں کسی پارٹی کے چھپے ہوئے غنڈے ہوا کرتے تھے، اب ان تمام محکموں کو اپوزیشن جماعتوں اور سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے، یہ کاروایاں مخالفین کو اس وقت تک دہشت میں ڈالتی ہیں جب تک وہ مخالفین ان کی جماعت میں شامل نہیں ہوجاتے۔

جمہوریت میں احتساب ضروری ہے، حکومت جو کرے اس کی جواب دہی جمہوریت کو برقرار رکھتی ہے۔ حال ہی میں جنتر منتر پر طلباء اور عوام نے جو احتجاج کیا وہ اس کی اعلیٰ مثال ہے، جب حکومت جواب دہی کے لیے تیار نہ ہو تو باشعور عوام کو باہر نکلنا ہوگا اور حکومت پر دباؤ بنا کر جواب دہی کے لیے تیار کرنا ہوگا۔

میڈیا کو جمہوریت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے لیکن جب تک وہ آزاد ہو، گزشتہ برسوں میں اس حکومت نے میڈیا کے بڑے اداروں کو مختلف ہتھکنڈوں سے خرید لیا اور جو صحافی ان کی حمایت کے لیے راضی نہ ہوا اس کو مرکزی دھارے سے ہٹا دیا، اب ان کی قسمت میں ایک الگ یوٹیوب چینل ہی رہ گیا ہے، اب اصل میڈیا میں وہی لوگ رہ گئے ہیں جن کو حکومت سے جو بھی کرایا جاتا ہے وہی کہتے ہیں۔

سوشل میڈیا، انٹرنیٹ جمہوریت کا وہ ستون ہے جہاں اظہار رائے کی آزادی ہوتی ہے لیکن موجودہ حکومت اپنی مخالفت کو روکنے کے لیے جمہوریت کے اس ستون کو ڈھانے کا کام کررہی ہے۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ ہندوستانی آئین کے محافظ سمجھے جاتے ہیں، حالیہ برسوں میں عدلیہ کے بعض فیصلوں کو جمہوری نظام کے لیے اہم قرار دیا گیا جبکہ بعض معاملات میں تاخیر یا حساس مقدمات کی سماعت میں موجودہ حکومت کی رضامندی شامل حال رہی۔

اسی طرح الیکشن کمیشن، پارلیمنٹ، اطلاعاتی کمیشن اور دیگر آئینی اداروں کی جانب داری ثابت ہوئی ہے۔

انتخابی بانڈ اسکیم سیاسی فنڈنگ میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ حکومت نے اسے شفافیت اور رسمی مالی نظام کو فروغ دینے کا ذریعہ قرار دیا، جبکہ ناقدین نے کہا کہ اس سے عطیہ دہندگان کی معلومات عوام سے پوشیدہ رہتی ہیں اور سیاسی مساوات متاثر ہوسکتی ہے، اس موضوع پر عدالتی کارروائیوں نے سیاسی فنڈنگ کے نظام پر نئی بحث کو جنم دیا۔

ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ کامیابیوں اور آزمائشوں دونوں سے عبارت ہے۔ 1975ء کی ایمرجنسی سے لے کر حالیہ برسوں کے آئینی، سیاسی اور سماجی واقعات تک متعدد ایسے مراحل آئے جنہوں نے جمہوریت پر کاری ضرب لگائی ہے لیکن اگر جمہوری ادارے اور شعبوں میں توازن قائم رہا تو ہندوستان اپنی جمہوری روایت کو مزید مضبوط بنا سکتا ہے۔

ایک حقیقت بہرحال واضح ہے کہ جمہوریت صرف انتخابات کے انعقاد سے زندہ نہیں رہتی بلکہ اس کی بقا آئین کی بالادستی، قانون کی مساوی حکمرانی، آزاد عدلیہ، مضبوط پارلیمنٹ، آزاد میڈیا، جواب دہ حکومت اور باشعور عوام پر منحصر ہوتی ہے۔ ہندوستان کی جمہوریت کا مستقبل بھی انہی اصولوں کی مضبوطی یا کمزوری سے طے ہوگا۔ یہی وہ عوامل ہیں جو نہ صرف حال کو بلکہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کو بھی تشکیل دیں گے۔

الحاد کا طوفان - اسباب اور علاج

محمد نجم الدین الرحیمی ندوی

مسلم فلاسفہ کی فکر ونظر اور ان کے رجحان واستدلال کے پس منظر اور منبع ومصدر میں وحی الٰہی کو بنیادی مصدر علم اور اساسِ عرفان کی حیثیت حاصل ہے، امام ابوالحسن اشعری علم الکلام میں اشاعرہ مکتب فکر ونظر کے اساس گزار ہیں، انہوں نے علم وفکر اور فلسفہ کے چراغ کی وحی سے روشنی حاصل کی اور وحی کو عقل وخرد پر برتری اور فوقیت دی، یہی اشاعرہ کا نظریہ ہے، کیوں کہ یہ وہ فلسفہ ہے کہ معرفت حق عقل وخرد کے ذریعہ ممکن نہیں اور یہ کہ ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات، وحی کو مصدر علم جاننے اور سمجھنے میں جہاں عافیت ہے وہیں فطرت کا تقاضا بھی ہے اور اس طرح انسان کو کسی غیر کی جستجو آوارہ نہیں رکھے گی، اسلام عقل وخرد اور شعور کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا ہے لیکن عقل کی تقدیر میں وحی الٰہی اور آیات بینات کی رہنمائی نہیں ہوتی، فلاسفہ عقل وخرد کو زیادہ اہمیت دینے کے باوجود صاف نظر آتا ہے کہ ان کے نظریات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور عقل وخرد کے نظریات ہر دم متغیر ہوتے ہیں، بایں ہمہ معرفت وادراک حقیقت کے لیے عقل پر کلی اعتماد بڑی لغزش اور فکری وذہنی بے راہ روی سمجھی جائے گی، اس لیے کہ اس سلسلہ میں عقل وخرد کا سہارا کافی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ عقل محض کا وجود ہی ناممکن ہے اور عقل محض خام خیال ہے، یہ بات اس نے Critique of pure reason میں تحریر کی ہے، جب زندگی اور کائنات کے حوالہ سے عقل وخرد کا یہ حال ہے تو مابعد الطبعیاتی دنیا تک اس کی رسائی بالکل ناممکن اور محال ہے۔ یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ حصول علم ومعرفت کے اسباب ووسائل میں ایک تجربہ بھی ہے، سائنس نے اس میں بڑی اہمیت دی ہے کیوں کہ اس میں تجزیہ اور تجربہ کے ذریعہ نتیجہ تک پہنچنے کی سعی کی جاتی ہے، اسی لیے سائنس تجربہ وتجزیہ کے سہارے حقیقت کے ادراک ومعرفت تک وصول چاہتی ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو شے اس کے ادراک وتجربہ میں نہ آئے اس کا انکار کر دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو حقیقت کے پانے میں اساس وبنیاد گردانا ممکن نہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فرانس میں ایک فلسفی ہوا ہے جس کا نام ہنری برگسان ہے، اس نے عقل وخرد کے سہارے حقیقت کی تلاش کا انکار کر کے وجدان کا سہارا لیا اور اس پر اعتماد کیا ہے اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر بھی اس نے نقد کیا ہے، اس نے اپنے اس نظریہ کو Creative evolution میں پیش کیا ہے اور بڑی اہم بات کہی ہے کہ ''وجدان عقل سے عمیق تر چیز ہے۔'' دور جدید کے ذہنوں نے اس کے ذریعہ روشنی اور بامقصد وکامیاب زندگی کی شاہراہ تلاش کی' وہاں یہ سائنس پردہ بن کر حائل رہی، کیونکہ مابعد الطبیعات، وحی الٰہی، عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ مجازات جیسے اہم مباحث کے لیے الٰہی ہدایت (Divine Guidance) اور آسمانی صحائف کے بغیر حقیقی علم اور صحیح رہنمائی حاصل نہیں ہوتی، وقت کے گزرنے کے ساتھ ٹی ایچ ہکسلے کی بات بھی تاریخ کے کباڑ خانہ میں پڑی رہ جائے گی کہ ''مذہب آخری طور پر شکست کھا کر اکھاڑے سے نکل چکا ہے'' یہاں پر اس بات کا اظہار غیر محل نہیں کہ کانٹ نے جو فلسفہ پیش کیا تھا، اس سے سات سو سال پیشتر اسی طرح کا نظریہ پیش کیا تھا کہ عقل کا دائرہ کار محدود ہے اور وہ غیر مظہر اور مافوق مظہر کو نہ تو سمجھ سکتی ہے اور اس کا بیان کر سکتی ہے، یہ وحی کا دائرہ کار ہے۔ اس بات کو صدیوں بعد کانٹ نے بھی کہا اور

چونکہ اس کے نظام فلسفہ میں وحی کی کوئی حیثیت نہیں، کیوں کہ وہ ایک نصرانی ہے، اس لیے اس نے Practical reason کے الفاظ کو استعمال کیا ہے۔اوپر امام ابوالحسن اشعری کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ عقل وشعور پر وحی کو فوقیت دی، انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک جس پر ہم قائم ہیں' یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول کو مضبوط پکڑا جائے اور صحابہ وتابعین اور ائمہ حدیث سے جو منقول ہے' اس کو اختیار کیا جائے، ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں۔'' (کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ :۸)

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے امام اشعری کے تذکرہ میں ان کا عقیدہ ونظریہ کی وضاحت میں لکھا ہے کہ امام ابوالحسن اشعری خود اس بات کے قائل وداعی ہونے کے باوجود عقائد کا ماخذ اور الٰہیات ومابعدالطبعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب وسنت اور تعلیمات نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد اور قیاسات یا یونانی الٰہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور ان کی بنیاد پر مستقل فرقے بن گئے ہیں' ان سے صرف اس بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل ومباحث اور الفاظ واصطلاحات کا ذکر نہیں ہے، ان کے نزدیک اس سے سنت وشریعت کے وقار کو نقصان پہنچے گا اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، نیز فرق باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں' خود اہل سنت کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد کا ماخذ یقیناً وحی ونبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم' کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے اقوال وروایات ہیں۔''

(تاریخ دعوت وعزیمت:۱/۱۰۹-۱۱۰)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ مذہب اس وقت تک مذہب نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کے معلومات کی اساس وبنیاد عقل وخرد اور حواس کے بجائے وحی والہام اور اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم پر نہ رکھی جائے، اگر دنیا میں کہیں ایسا ہے تو یہ حقیقت مانی جائے گی کہ وہ مذہب نہیں بلکہ اس کی حیثیت صرف ایک فلسفہ کی ہے، اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی وخدائی علم کے سہارا کے بغیر اور اس سے رشتہ توڑ کر باری تعالیٰ کو ماننا کسی وہم پرستی سے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے پرفیسر لیٹر کی یہ بات نقل کی ہے کہ ''مذہب کا سرچشمہ روز بہ روز وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے، فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کررہے ہیں، انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہے اور اسی سے وہ قوت پائے گی۔'' (الکلام)

انسان کی فطرت اور ذہن میں ابھرنے والے مذہبی سوالات کے حل کی اسی فطری راہ کا نام ہزاروں سال سے قائم ہے، جب بھی انسانی فطرت میں ارتعاش ہوا، اسی فطری راہ نے تسکین وسکون عطا کی اور سوچنے کی بات ہے کہ پیاس لگی ہو اور اس کو بجھانے کا سامان نہ کیا جائے' تو یہ ناممکن اور محال بات ہوگی، اس لیے اس فطری راہ کو جسے ''وحی ونبوت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، تمام لا ینحل عقدوں کی گرہ کشائی کی ہے جن کہ ان مسائل وامور اور ذہن وفطرت میں ابھرنے والے سوالوں کا تشفی بخش حل' عقل وحواس اور وجدان کے گوشہ میں نہیں ہے، کیوں کہ فطری صلاحیت سے گریز کرکے قدرتی قانون کو توڑنے کی کوشش کی اور انھوں نے وحی اور نبوت سے ناطہ توڑ کر ان سوالوں کے جوابات کی کوشش کی تو نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا کیا گل افشانیاں اور قیاس آرائیاں وموشگافیاں کرکے اور زیادہ مشکل بنادیا، قرآنی زبان میں ان کو اوہام سے تعبیر وتشریح کرسکتے ہیں اور ان اہل عقل وخرد، اہل وجدان اور سائنس دانوں نے اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونے کا کبھی اظہار واعتراف نہیں کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ ان کے علم وفکر، غور وفہم کے نتائج یکساں اور ایک نہیں بلکہ ان میں تعارض اور تضاد ہے، المختصر یہ کہ انھوں نے نظریات وتصورات کے جنگلات میں آبلہ پائی کی ہے' وہ انسانی عقل وفہم کے عجائبات میں سے ہے اور وحی اور نبوت ہی اس کا تشفی بخش حل اور اس کے بلند مقام پر کھڑے انبیاء ہی اصل رہنما ہیں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں

محمد امین حسنی ندوی

انسانی زندگی کا سب سے نازک دور جوانی کا دور ہوتا ہے، یہ وہ دور ہے جس میں ایک طرف جذبات کا سیلاب اس کے اندر موجزن ہوتا ہے تو دوسری طرف ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اس کے کاندھے پر ہوتا ہے، ایک طرف اگر طاقت کے بل پر ہر چیز حاصل کر لینے کا جوش ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کے نتائج بھی نگاہوں میں گردش کر رہے ہوتے ہیں، ایک طرف اگر اقدام کا جذبہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کے عواقب پر بھی نگاہ ہوتی ہے، غرض یہ دور دودھاری تلوار کی مانند ہوتا ہے، اس دور کا صحیح استعمال اگر زندگی کو خوبصورت بناتا ہے تو دوسری طرف غلط استعمال زندگی کو بوجھ بنا دیتا ہے، غرض یہ سمجھ لیجیے جوانی جسم فانی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے، پورا جسم جس طرح ریڑھ کی ہڈی پر ٹکا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح فانی زندگی کا پورا دارومدار جوانی پر منحصر ہوتا ہے اور جوانی کے کارنامے بڑھاپے کا مضبوط سہارا بنتے ہیں۔

ہر زمانے میں نوجوان ہی امت کا مضبوط سہارا اور اس کی ترقی کا ضامن ہوتا ہے، نوجوان ہی اپنی قوم کا محافظ ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ طبقہ توانائی سے مالا مال ہوتا ہے، قوت سے لبریز ہوتا ہے، جوش وجذبہ والا ہوتا ہے، علامہ اقبال نے اس تصویر کو یوں پیش کیا ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

لیکن جوانی اس وقت مفید اور کارآمد ہوتی ہے جب اس کا استعمال مثبت طریقہ سے ہو، قرآن وسنت کی روشنی میں ہو، تعمیر کے لیے ہو نہ کہ تخریب کے لیے، ترقی کے لیے ہو نہ کہ تنزلی کے لیے، اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہو لیکن یہ بات مدنظر رہے کہ جوانی میں جوش ہوتا ہے، خون میں گرمی ہوتی ہے، مزاج میں حدت ہوتی ہے، لہجہ میں بسا اوقات سختی ہوتی ہے، ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ جوانی کے دور کے کچھ لمحات کسی اللہ والے کی نگرانی اور سرپرستی میں گزارے تاکہ خود اس کی زندگی کو صحیح سمت ملے، خود اس کو جینے کا مطلب سمجھ میں آئے، خاص کر علامہ اقبال نے جوانی کا جو بلند تصور پیش کیا ہے، اس سے واقف ہو اور سطحی باتوں سے اور سطحی کاموں سے اپنے کو روک کر اپنی نگاہ پہاڑ کی چوٹیوں پر مرکوز کرے، علامہ اقبال فرماتے ہیں:

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اگر وہ ایسا کرے گا تبھی وہ معاشرہ کے لیے مفید ہوگا، انقلابات انہی نوجوانوں کے ذریعے وجود پذیر ہوتے ہیں، یہ عمر جہاں ایک طرف حالات کو بدلنے پر قدرت رکھتی ہے، وہیں دوسری طرف غلط راہ کو چنتی ہے، بے راہ روی، بداخلاقی، بدکرداری، غلط صحبت، ہر بری بات پر عمل بھی اس عمر میں ہونے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں، اکثر یہ عمر ضائع ہو جاتی ہے لایعنی کاموں میں، وقت کے ضیاع میں، خواہشات کی پیروی میں، آج کل اگر دیکھا جائے تو یہ منظر زیادہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ نوجوانی کی یہ عمر ضائع ہو رہی ہے، چاہے وہ موبائل کے ذریعہ ہو، یا لایعنی کاموں میں اس کا استعمال ہو رہا ہو، سوشل میڈیا پر گھنٹوں بحث ومباحثہ میں وقت صرف کیا جا رہا ہے، تعمیری کاموں کے بجائے تخریبی کاموں میں زندگی کھپائی جا رہی ہے، ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس کو اللہ نے صلاحیتوں سے نوازا وہ اپنی تشہیر میں لگا ہے اور دوسروں کے کاموں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے، اختلاف کو مخالفت کا روپ دیتا ہے، برداشت، تحمل مزاجی، بردباری، اخلاص وللّٰہیت سے اس کی زندگی بالکل مختلف ہے۔

تاریخ انسانی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی بڑی شخصیات پیدا ہوئیں اور جنہوں نے معاشرے پر ایک گہرا اثر چھوڑا، چاہے وہ علماء ہوں یا فاتحین جنہوں نے اپنی نوجوانی کو ایک مقصد دیا، اپنی زندگی کی سمت طے کی اور اسی کے اعتبار سے آگے بڑھتے چلے گئے، ہر برے کام سے اپنی جوانی کو بچا کر رکھا، اسلام نے بھی جوانی کی حفاظت کرنے اور اپنے آپ کو بچانے کی ترغیب دی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ قرآن میں اسی لیے بیان کیا گیا ہے۔

نوجوانی انسان کی زندگی کا سب سے اہم مرحلہ ہے، کیونکہ اسی دور میں وہ اپنی جسمانی طاقت اور صلاحیت کے عروج پر ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں اس کے اندر جوش، جذبہ اور خود کو نیز اپنے معاشرے کو بہتر بنانے کی زیادہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

یہ فکری پختگی اور ذہنی بلوغت کا دور بھی ہے، برخلاف اس تصور کے جو بعض لوگ رکھتے ہیں کہ نوجوانی صرف جذباتیت، بے احتیاطی اور غیر سنجیدگی کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا فرمائی اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی ان کی جوانی کے دور میں مبعوث فرمایا، کیونکہ یہ انسانی زندگی میں فکری پختگی اور بہترین ذہنی استعداد کا مرحلہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں:

"آج عالم اسلام کو ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال و متاع اس کے لیے وقف کر دیں، کسی جاہ و منصب یا عہدہ و حکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، کسی کے لیے ان کے دل میں کینہ و عداوت نہ ہو، فائدہ پہنچائیں خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں، ان کا طرز عمل سیاسی رہنماؤں کے طرز عمل سے ممتاز اور ان کی دعوت و جدو جہد سیاسی تحریکات (جس کا مطمحِ نظر محض حصولِ اقتدار ہوتا ہے) مختلف اور جداگانہ ہو۔ اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز!"

اسلام نے نوجوانی کے دور میں بھرپور فائدہ اٹھانے پر زور دیا ہے، حضور اکرم ﷺ کی احادیث میں اس طرف وضاحت ملتی ہے، ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"سات لوگوں کو اس دن عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا جس دن اس سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، ان سات لوگوں میں ایک وہ شخص بھی ہوگا جس کی جوانی اللہ کی عبادت میں پروان چڑھے۔"

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا:

"اپنی جوانی کو غنیمت سمجھو بڑھاپے سے پہلے۔"

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وقت کا صحیح استعمال کرنا چاہیے، اس کو ضائع کرنے سے بچانا چاہیے، لایعنی کاموں میں اپنا وقت نہیں لگانا چاہیے۔

اسی طرح نوجوانوں کو سب سے بڑھ کر ایمانی تقاضوں کو پورا کرنا اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے، وہ علم حاصل کرنا چاہیے جو مفید ہو اور جس کے ذریعہ قوم کو فائدہ پہنچے، اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے، معاشرے کی خدمت کرنی چاہیے، دعوت دین کا فریضہ انجام دینا چاہیے، اپنے وقت کو صحیح کاموں میں لگانا چاہیے، ان کے اندر ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے، آج ضرورت ہے کہ ایسی صالح جماعت کا وجود ہو جو اپنی قوم کی اصلاح کا فریضہ انجام دے اور ان کو تاریکی سے نکال کر اسلام کی روشنی عطا کرے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نوجوانوں کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اسلام کو اس وقت نئے خون، نئی امنگوں، نئے ولولے اور نئے جوش عمل اور جذبہ قربانی کی ضرورت ہے، یہ نیا خون، نیا جوش اور قربانی بہت سی جگہ موجود ہے لیکن پست مقاصد اور غلط میدانوں میں صرف ہو رہا ہے، جو چیز اسلام کے کام نہیں آ رہی ہے وہ صرف ضائع ہو رہی ہے بلکہ دنیا کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے، اسلام کی دعوت ابھی ان گوشوں میں نہیں پہنچی۔" (نیا خون: ۲۴)

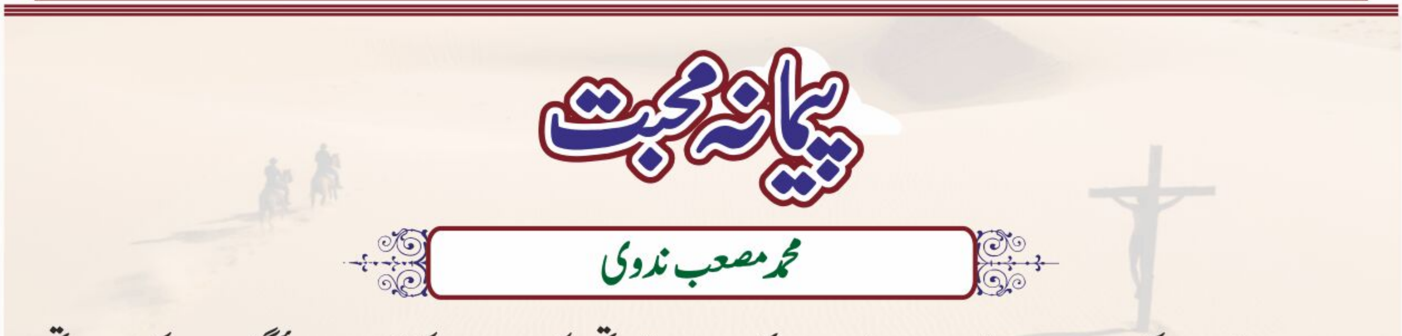

پیمانہ محبت

محمد مصعب ندوی

جواں مرد تختہ دار پر کھڑا ہے، چہرہ پر خوف وہراس کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں ہے، کشادہ پیشانی مہر تاباں کے مثل پر نور ہے، آنکھیں بتا رہی ہیں کہ اس کو اس کی حقیقی منزل ملنے والی ہے۔

ہر طرف شور برپا ہے، ابھی اس کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا، بچے بوڑھے مرد وعورت کی ایک بھیڑ تختہ دار کے پاس اُمڈ آئی ہے، دردناک سزا دی جائے گی بلکہ سرداران قریش کی طرف سے اعلان ہوا ہے کہ لوگ گھر سے باہر نکل آئیں اور محمد کے ساتھی، محمد کے پیروکار کا عبرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مزہ لیں۔

تختہ دار پر موجود شخص کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہے، اس کی ذات سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے ایک خدا کو مان لیا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھ لیا ہے، اس نے قتل وغارت گری، شراب وکباب، جوا وقمار بازی کو برا جان کر چھوڑ دیا ہے، وہ بچیوں کو زیر زمین زندہ دفن نہیں کرتا ہے، وہ ان قریش والوں کی طرح لات ومنات کے آگے سر نہیں جھکاتا ہے، اس نے اپنے آباء واجداد کے بنائے ہوئے جاہلی رسم ورواج سے کنارہ کش ہو کر حق اور سچ کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ عاطفت میں پناہ لے لی ہے، یہی اس کا جرم ہے، سرداران قریش کے نزدیک اس جرم کی سزا موت ہے۔

قریش کا یہ مجرم کوئی اور نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابی حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہیں جو تختہ دار کے پاس پرسکون کھڑے ہوئے ہیں، جن کو کفار قریش نے دھوکے اور چال بازی سے گرفتار کر لیا ہے، یہ گرفتاری کسی میدانِ جنگ کی شکست کا نتیجہ نہ تھی بلکہ عہد وپیمان کی آڑ میں رچائی گئی غداری کی داستان تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس حضرات پر مشتمل صحابہ کرام کی ایک جماعت کو کسی خاص مشن کے تحت روانہ فرمایا تھا، اسی جماعت میں حضرت خبیب بھی تھے، راستے میں قبیلہ بنولحیان کے سو مسلح افراد نے ان کو گھیرے میں لے لیا اور یہ وعدہ کیا کہ اگر تم لوگ پہاڑی سے اتر کر سامنے آجاؤ تو ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے، تمہاری جان بخش دیں گے، مگر کفار ومشرکین کیسے وفا کر سکتے ہیں، توحید کے پرستاروں کے ساتھ، جن ہاتھوں نے امان کا یقین دلایا تھا، انہی ہاتھوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ کئی جاں نثار صحابہؓ شہادت سے سرفراز ہوئے اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ گرفتار کر لیے گئے۔

پھر انتقام کی آگ میں جھلس رہے کفار نے انہیں مکہ والوں کے ہاتھ بیچ دیا تاکہ بدر کی شکست فاش کا بدلہ ایک بے بس قیدی کے ذریعہ لے لیا جائے، ابھی جلدی ہی تو مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت نے قریش کو بدر کے میدان میں رسوا کن شکست دی ہے، قریش کہیں منھ دکھانے لائق نہیں بچے ہیں، وہ کیسے بھول سکتے ہیں اپنے سردار ابو جہل اور عتبہ کی دردناک موت کو۔ آج قریش کے ہاتھ موقع آیا ہے کہ وہ محمد کے ایک ساتھی کو مجمع عام کے سامنے قتل کر کے اپنے دامن پر لگے ہوئے ذلت ورسوائی کے داغ کو دھلنے کی کوشش کریں، مگر انہیں کیا خبر تھی کہ وہ صرف ایک مسلمان کو نہیں قتل کر رہے ہیں بلکہ وہ تاریخ میں ایثار ومحبت کے ایک ایسے باب کو زندہ وتابندہ کرنے جا رہے ہیں جس کی روشنائی قیامت تک خشک نہیں ہو سکتی، جس کی کرنیں ایمان والوں کو حرارت بخشتی رہیں گی۔

موت حضرت خبیب کے سامنے ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کے جسم کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے مگر وہ مطمئن ہیں کہ محمد کی غلامی میں موت کا آنا دنیا کی تمام بخششوں اور کامیابیوں سے بہتر ہے، حضرت خبیب کا چہرہ بشاشت سے نکھر رہا ہے، کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ جب میں مسلمان ہونے کی حالت میں شہید کیا جارہا ہوں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ کی راہ میں میرا جسم کس پہلو پر گرے گا، یہ سب کچھ میرے اللہ کی رضا کے لیے ہے اور اگر وہ چاہے تو میرے (جسم کے) کٹے پھٹے ٹکڑوں اور جوڑوں پر بھی برکت نازل فرمادے گا۔

حضرت خبیبؓ کی نگاہیں سامنے کھڑی موت کو نہیں بلکہ اس جنت کو دیکھ رہی تھیں جس کا وعدہ اللہ نے اپنے وفادار بندوں سے فرمایا ہے۔ جسم چھلنی ہوسکتا ہے، خون کی دھاریں پھوٹ سکتی ہیں، روح جسم سے پرواز کرسکتی ہے مگر وہ دل جس میں محبت رسول و معرفت الٰہی بسی ہو، اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے چہرے پر خوف کی جگہ سکون، اضطراب کی جگہ اطمینان اور مایوسی کی جگہ مسرت نمایاں تھی؛

ادھر مجمع میں ہر طرف سے آوازیں اٹھنے لگی ہیں، ٹھٹھے لگ رہے ہیں، فقرے کسے جارہے ہیں، کوئی کہتا ہے: کیا مل گیا محمد کی غلامی اختیار کر کے؟ پلٹ آؤ اپنے پرانے رسم و رواج کی طرف، عزیٰ ومنات کی طرف، کوئی کہتا ہے چھوڑ دو اسلام جان بخشی جائے گی، کہیں سے آواز آتی ہے کہ کوئی آخری تمنا ہے تو بتلاؤ پوری کر دی جائے، اسی شور وغل میں حضرت خبیب کی ایک باوقار صدا فضا میں بلند ہوتی ہے، کہتے ہیں: دو رکعت نماز پڑھنے کی تمنا ہے اور آپ دو رکعت کی نیت باندھ لیتے ہیں، کیا ہی پرسکون نماز تھی، نماز سے فارغ ہوئے، گویا آپ کے قلب مبارک پر شبنم برس رہی ہو، اس قدر خوش تھے، کہا: میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنی نماز کو لمبی کروں مگر مجھے یہ ڈر رہوا کہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ موت کے ڈر سے نماز کو طویل کر رہا ہوں۔

قریش اس ثابت قدمی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے، حضرت خبیب کو صلیب پر چڑھا دیا گیا، تیر اندازوں نے اپنے ہنر آزمائے، تیر جگر کے پار ہوئے، زخم پر زخم لگنے لگے، اسی اثناء میں ایک بدبخت طنزیہ انداز میں مچل کر کہتا ہے: خبیب! کیا تم سوچ رہے کہ محمد تمہاری جگہ ہوتے اور تم بچ جاتے؟ حضرت خبیب جلال میں آ گئے، شکستہ حالت میں زخمی شیر کی طرح بپھر کر دہاڑا: خدا کی قسم! مجھے یہ تک گوارا نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کانٹا چبھ جائے اور اس کے بدلے میری جان بخش دی جائے۔

محفل پر ایک سناٹا طاری ہو گیا، لوگوں نے اس جواب کو سن کر دانتوں تلے انگلیاں دبالیں، حضرت خبیب کا جسم تیروں سے چھلنی کر کے ٹھنڈا کر دیا گیا، آپ نے شہادت کو خوشی خوشی گلے لگالیا۔

یہ ہیں ہمارے اصل ہیرو، قربان جایئے حضرت خبیب کی اپنے نبی سے محبت پر، ایمان اور اسلام سے محبت پر۔

اس میں عبرت ہے مسلمان مرد وعورت کے لیے جو ذرا سی آزمائش پر ایمان سے سمجھوتہ کرتے ہیں، اس میں وہ پیمانہ محبت ہے جس پر ہم اور آپ اپنے آپ کو تولیں، حضرت خبیب اور تمام صحابہ کرام کی ذات ہمیشہ سے سراپا ایثار وقربانی کی پیکر رہی ہے، یہی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، یہی ہیں ہمارے قائد ورہنما، خبیب اور آپ کے ساتھیوں کی جماعت وہ مبارک جماعت ہے جس کے ایمان کی تربیت، جس کی شخصیت سازی خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اس جماعت میں آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی 23 سالہ زندگی کی چمن بندی کا حاصل مل جائے گا۔

اس لیے ہم مسلمانوں کو اگر ہزاروں جماعتوں میں سے کسی کا انتخاب کرنا ہو، سمندر میں سے ایک موج پر توجہ مرکوز کرنی ہو، رنگ برنگے پھولوں میں سے کوئی ایک پھول لینا ہو، دھنک کے سات رنگوں میں ایک کا نام لینا ہو تو ہم بغیر کسی تردد کے جماعت صحابہ کا نام لیں گے۔

ارتداد کی لہر- اسباب اور علاج

محمد ارمغان بدایونی ندوی

اگر کوئی شخص کلمہ طیبہ کا قائل ہونے کے بعد مذہب اسلام سے (نعوذ باللہ) متنفر ہو جائے اور دین کے بنیادی عقائد کو نہ مانے، یا وہ دینی فرائض پر جان بوجھ کر عمل نہ کرنے کا اعلان کرے تو وہ شریعت کی اصطلاح میں ''مرتد'' کہلاتا ہے، ارتداد کی یہی وہ واضح شکل ہے جس کے متعلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جملہ مشہور ہے کہ ''میرے جیتے جی دین میں کتر و بیونت ممکن نہیں۔''

تاریخ اسلام میں مجموعی طور پر ایسے واقعات بہت کم ملیں گے جن سے معلوم ہوتا ہو کہ ایک ہی وقت میں پورا علاقہ اس نوعیت کے ارتداد کا شکار ہوا ہو بلکہ ہر دور میں بہت سی کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود مسلمانوں کے اندر اپنے دین کے تئیں ادب ولحاظ کے جذبات پائے جاتے رہے ہیں، بعض اوقات یہ ممکن ہے کہ مسلمان بجائے خود سنتوں پر عمل نہ کریں لیکن یہ بات کسی ادنیٰ مسلمان کو کبھی گوارا نہ ہوئی اور نہ ہوگی کہ اس کے نبی پاک ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کی جائے۔ اپنے دین ومذہب کے لیے مر مٹنے کا یہی وہ جذبہ ہے جس سے دنیا کے دوسرے مذاہب تہی دامن ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نہ ان کے پاس ایک مکمل نظام زندگی موجود ہے اور نہ ہی کوئی ایسی شخصیت جو ان کے لیے آئیڈیل بننے کی اہل ہو۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اگر علانیہ طور پر دین بیزاری کی لہر چلائی جائے، یا قوم مسلم کے سامنے اس کے دینی شعائر کا مذاق اڑایا جائے تو اسے کوئی صاحب ایمان برداشت نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں دشمن طاقتوں کے لیے یہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ہمارے اس نئے خون کو ذہنی وفکری لحاظ سے قلاش بنا دیں جو مستقبل میں قیادت کا فرض منصبی ادا کرنے کا اہل ہو سکتا تھا۔

موجودہ دور میں ارتداد کی جو ایک عام لہر نظر آتی ہے، حقیقت میں یہ اسی منصوبہ بند سازش کا ایک حصہ ہے، اس وقت جو نظام تعلیم رائج ہے، تربیت کے مواقع جس طرح مفقود ہیں اور مادیت کی خوں خوار موجیں خس وخاشاک کی طرح ہر چیز کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہیں نیز بے حیائی وفحاشی کی ارزانی نے بغیر مذہب وملت کی تفریق کے جس طرح پوری نسل نو کو برباد کر دیا ہے، اس کے بعد اس کی توقع کرنا مشکل ہے کہ کوئی بھی نسل اپنے مذہب پر باقی رہ سکے گی۔ مذہب کے متعلق اگر کوئی تصور ہے تو بس اتنا کہ وہ چند عبادات کا مجموعہ ہے۔

اگر دیکھا جائے تو اس وقت ارتداد کے جو واقعات پیش آ رہے ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں کہ لوگ دینی احکام واعمال سے متنفر ہیں اور ان کی طبیعت اس پر عمل کے لیے آمادہ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھیں اپنے مذہب کا علم نہیں اور نہ ہی وہ ایمان وعقائد سے واقف ہیں، ان کے نزدیک اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی مذہبی رسومات میں شریک ہو جانا، مشرکانہ اعمال کو برا نہ سمجھنا، یہاں تک کہ غیروں کے ساتھ شادی کر لینا بھی کوئی معیوب بات نہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ مذہب کو ان سب کاموں پر اعتراض کا کوئی حق نہیں، یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں کے ہر علاقہ میں ایسے سوہان روح واقعات پیش آ رہے ہیں جن سے پوری قوم مسلم کا سر شرم سے جھک جائے۔

ارتداد کی یہ شکل اصطلاحی ارتداد سے زیادہ خطرناک ہے، اس لیے کہ اصطلاحی طور پر مرتد ہونے والا زمرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تاہم ارتداد کی موجودہ شکلوں میں آدمی کا نام اور اس کی پہچان مسلمانوں کی ہوتی ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس!

یاد رکھیں! اگر موجودہ صورت حال اسی طرح برقرار رہی تو ہماری

بربادی کے لیے کسی بیرونی دشمن یا اسلحے اور فوج کی ضرورت نہیں بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں پوری طرح برباد ہو جائیں گے۔ اس وقت ہم میں سے ہر فرد کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے کہ پانی کہاں مر رہا ہے اور بنیادی غلطیاں کیا کیا ہو رہی ہیں؟! پھر یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ اس کے علاج اور تدارک کی کیا شکلیں ممکن ہیں؟!

اس وقت ایمان وعقائد کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے لیے جو نصاب ونظام تعلیم رائج ہے، وہ ایسا زہرناک ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کے اندر دین کی بے وقعتی پیدا ہونا یقینی ہے، ابتداء میں اس پر دھیان نہیں دیا جاتا پھر وہی چیز ناسور بن جاتی ہے۔

یہ بھی اس وقت کا ایک المیہ ہے کہ آدمی پڑھنے لکھنے کی دنیا سے جب فرصت پاتا ہے تو اس کی تفریح طبع کا سب سے دلچسپ ذریعہ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل دنیا ہے جس کے بغیر موجودہ نسل ایک منٹ نہیں گذار سکتی، سوشل میڈیا کا بے قید استعمال نسل نو کے حق میں زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ فواحش ومنکرات کا سیلاب بلاخیز اور مذہب سے دوری پیدا کرنے والے افکار ونظریات کی یہ ایسی مفت ٹیوشن ہے جس کی موجودگی میں کسی بیرونی اور منصوبہ بند پلاننگ کی ضرورت نہیں۔

مسلم گھرانوں میں ایمان وعقائد کی عدم حساسیت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے، ہمارے سامنے بچوں کے تابناک مستقبل کا چیلنج تو ہوتا ہے لیکن ایمان واسلام کو ایک پشتینی وراثت سمجھ لیا جاتا ہے جس کے متعلق فکرمندی کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے بچے مخلوط نظام تعلیم کا حصہ بنتے ہیں اور مختلف مذاہب کے بچوں کے ساتھ بند کمرے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو وہ بڑی آسانی سے دین کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔

مسلم سماج کا فکری وعملی جمود بھی اس صورت حال کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے، آج کا نوجوان ذہن ودماغ میں خرافات ووساوس اور مذہب کے متعلق بہت سے شکوک وشبہات کا شکار ہے، اپنی مادی زندگی کے گیسوئے برہم کو سلجھانے میں سرگرداں ہے، اعلیٰ معیار زندگی کے حصول میں سرپٹ دوڑ رہا ہے، مادیت کی اس ریس میں دولت کا بے انتہا حریص ہے۔ اسی لیے اگر اس کو اچھی ملازمت یا تجارت کا کوئی زریں موقع مل جائے تو وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ اس کا دین باقی رہے گا یا نہیں؟ اسی طرح اگر ناجائز محبت کا اسیر ہو جائے تو بھی وہ دین ومذہب کے حدود وقیود کو خاطر میں لانا گوارا نہیں کرتا۔ گویا اس کے نزدیک مذہب ایک ثانوی درجہ کی چیز ہے، جب کہ مادی زندگی کی ترقی اس کی اولین ترجیح ہے۔

موجودہ حالات کی سنگینی ہر مسلمان سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی سطح پر دین وملت کے لیے بیدار ہو، اپنے متعلق افراد اور سماج کا بھرپور جائزہ لے، ایمان وعقائد کی حساسیت کو سمجھے اور سمجھائے، بہتر ماحول میں تعلیم دینے کی کوشش کرے، عصری تعلیم کے مواقع بھی فراہم کرے مگر ایمان میں پورے تصلب کے ساتھ، گھر اور خاندان میں ایمانی فضا بنائے، اسلام کے نظام اخلاق اور نظام معاشرت کا مطالعہ کرے اور نسل نو کو اس سے روشناس کرانے کی کوشش کرے، سوشل میڈیا کے بے مہار استعمال پر بندش لگائے، اپنے بچوں کی سوسائٹی، حلقہ احباب اور ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھے، سنتوں سے عشق ان کے مزاج میں پیدا کرے اور ان کے لیے روزگار کے ایسے جائز مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرے جو دین سے ہم آہنگ ہوں۔

اس وقت کی یہ بھی ایک بڑی ضرورت ہے کہ نسل نو کے ذہن ودماغ کو مطمئن کیا جائے، اس کے طرز فکر اور طرز زندگی کو متاثر کیا جائے اور اس کے رخ کو صحیح سمت دینے کی کوشش کی جائے، اس کے جائز تقاضوں کو پورا کرنے میں اگر مالی تعاون کی کفالت کا مسئلہ ہو تو اس پر بھی منظم طریقہ سے محنت کی جائے اور اپنے سماج کے ہر فرد کی اعانت ایک دینی فریضہ تصور کیا جائے۔ عام طور پر اس سلسلہ میں ہماری غفلت وکوتاہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل طاقتیں ہمارے کمزور اور مفلوک الحال لوگوں کا استحصال کر کے ایمان کا سودا کر لیتی ہیں۔

یہ وقت محض تحریروں، تقریروں اور میٹنگوں کا نہیں اور نہ ہی صرف چند خوش نما باتوں سے مسائل کا حل ممکن ہے، ضرورت ہے کہ زمینی سطح پر اتر کر حالات کا جائزہ لیا جائے اور لوگوں کی ضروریات کو سمجھ کر انھیں پورا کرنے کی کوشش کی جائے اور حقائق سے بھی آگاہ کیا جائے۔

ملفوظات داعی اسلام

حضرت مولانا عبید اللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ضبط وپیش کش:

محمد عظیم الدین ندوی

عقیدۂ توحید پر خصوصی توجہ کی ضرورت:

فرمایا: ”ہر مسلمان کو عقیدۂ توحید کی فکر کرنا نہایت ضروری ہے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کل زیادہ تر لوگ فروعات میں الجھے ہوئے ہیں مثلاً: نماز میں رفع یدین ضروری ہے کہ نہیں؟ آمین بالجہر اور قرأت خلف الامام کے بغیر نماز ہوگی یا نہیں؟ لیکن انھیں اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو کلمہ یاد نہیں ہے اور نہ ہی ان کا عقیدہ سلامت ہے اور اگر بالفرض کسی نے عقیدہ کی فکر کی بھی تو اس میں بھی اختلافی مسائل کو موضوع بنالیا جاتا ہے جس سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت ان مسلم نوجوانوں پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے جنہیں صحیح سے کلمہ بھی یاد نہیں اور یہی اس وقت کا اصل کام ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ آدمی بس نام کا مسلمان ہے اور ایمانی حقیقت سے بالکل بے بہرہ ہے، غور کا مقام ہے کہ اگر اسی حالت میں وہ مر جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟! اس لیے اس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ائمہ مساجد کو چاہیے کہ وہ ایک ایک گھر کا سروے کریں اور اپنی مسجد سے متعلق تمام افراد کے ایمان کا جائزہ لیں اور ان کو کلمہ کی دولت سے مالا مال کریں۔“

تین اہم باتیں:

فرمایا: ”پہلی بات یہ کہ حرام اور مشتبہ مال سے پرہیز ضروری ہے، اس لیے کہ حرام مال سے نسلیں بگڑ جاتی ہیں، اگر نسلوں کو بڑھانا اور ترقی دینی ہو تو حرام سے پرہیز فرض ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی کو کبھی تکلیف مت دو اور تیسری بات یہ کہ کبھی ظالم نہ بنو۔“

داعیان دین سے ایک اہم بات:

فرمایا: ”اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت حالات بہت نازک اور خراب ہیں، اس دور کا یہ ایک عام مرض ہے کہ لوگ دینی کام کرنے والوں کے خلاف بولتے رہتے ہیں، ایسے ناموافق حالات میں ہوا کے موافق چلنے کے بجائے ہوا کے خلاف چلنا ہی عزیمت ہے، اگر آدمی ڈٹا رہا تو یقیناً اس کو غیر معمولی ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی، ایسے شخص کی مثال ہوائی جہاز کی ہے جو ہوا کے خلاف اڑتا ہے اور گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جو ہوا کے موافق چل کر کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کی مثال بادبانی کشتی کی ہے، جو ہوا کے موافق ہو کر چلتی ہے اور بہت دیر سے ساحل مراد کو پہنچتی ہے۔ حاصل یہ کہ ایسے ماحول میں ہمت، جواں مردی اور جرأت رندانہ کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔“

حقیقی محبت کا تقاضا:

فرمایا: ”اگر آدمی کو حضور ﷺ سے سچی محبت ہو تو پھر اسلام پر عمل کرنا آسان ہوگا اور اس کو ایک راحت وسکون نصیب ہوگا لیکن یہ راحت اسی کو ملے گی جس کے اندر محبت کا صحیح جذبہ ہو، اگر کسی کے اندر محبت کسی دوسری غرض سے ہے تو اسے راحت نہیں مل سکتی اور وہ پریشان رہے گا۔“

منافق اور مومن کی پہچان:

فرمایا: ”منافق کی صفت ہے ہر ماحول میں ڈھل جانا، جب کہ مومن کی صفت ہے حق بات کے لیے جم جانا۔“

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 18 ⚜ August 2026 ⚜ Issue: 08

سید احمد شہید اکیڈمی کی پیشکش

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)